# کشمیر پر بھارتی عدالتی یلغار

افتخار گیلانی°

دسمبر ۲۰۱۴ء کے انتخابات کے بعد جب جموں و کشمیر میں ایک معلّق اسمبلی وجود میں آئی اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی) بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی بیساکھی کے سہارے اقتدار میں آئی، تب دونوں کے درمیان طے ہوا تھا کہ: ''ہندو قوم پرست بی جے پی بھارتی آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت کشمیر کو دیے گئے خصوصی اختیارات کو موضوع بحث نہیں بنائے گی''۔ بظاہر یہ وعدہ ایفا تو ہوا، مگر چور دروازے سے بی جے پی کی سرپرست تنظیم 'راشٹریہ سوامی سیوک سنگھ' (آر ایس ایس) سے وابستہ ایک تھنک ٹینک نے سپریم کورٹ میں رٹ دائر کی۔ جس میں دفعہ ۳۷۰ کے بدلے دفعہ ۳۵-اے کو نشانہ بنایا گیا، اور عدالت نے یہ پٹیشن [استدعا] سماعت کے لیے منظور بھی کر لی۔ اب حال ہی میں ایک اسپیشل بنچ قائم کر کے اس کی سماعت اگلے چند ہفتوں میں شروع کرنے کا عندیہ دیا گیا ہے۔

دفعہ ۳۵-اے کے تحت جموں و کشمیر میں غیر ریاستی باشندوں کے نوکری حاصل کرنے، ووٹ دینے اور غیر منقولہ جایداد خریدنے پر پابندی عائد ہے۔ اگر یہ دفعہ ختم کر دی گئی تو اس کے نتائج دفعہ ۳۷۰ کے خاتمے سے بھی زیادہ خطرناک ہوں گے۔ اگرچہ اسی طرح کی شقیں دیگر علاقوں یعنی: ناگالینڈ، میزورام، سکم، اروناچل پردیش، آسام، منی پور، آندھرا پردیش اور گوا کو خاص اور منفرد حیثیت عطا کرتی ہیں۔ وہاں بھی دیگر بھارتی شہریوں کو غیر منقولہ جایدادیں خریدنے پر پابندی عائد ہے یا اس کے لیے خصوصی اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، مگر مسلم دشمنی اور

° ایڈیٹر، اسٹرے ٹیجک افیرز، ڈی این اے، نئی دہلی

متعصب ذہنیت کے حامل افراد کو بھارتی آئین کی یہ شقیں نظر نہیں آتیں۔ اس پر ظلم یہ کہ بھارت کی مرکزی حکومت جو آئین کی محافظ اور نگران ہے، اس نے سپریم کورٹ میں آئین کی اس شق کا دفاع کرنے کے بجائے 'غیر جانب دار' رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر عدلیہ اس شق کو منسوخ کرتی ہے، تو بھارتی حکومت دنیا کو یہ باور کروائے گی کہ: ''یہ تو آزاد عدلیہ کا معاملہ ہے اور حکومت کا اس کے ساتھ کچھ لینا دینا نہیں ہے''۔ تاہم، سبھی رمزشناس یہ جانتے ہیں کہ دو سال تک اس پٹیشن کو التوا میں رکھ کر بھارتی حکومت، جسٹس دیپک مشرا کے چیف جسٹس بننے کا انتظار کر رہی تھی۔ خدشہ تھا کہ اگر اس پٹیشن کی سماعت اس سے قبل ہوتی تو حال ہی میں ریٹائر ہونے والے چیف جسٹس، جسٹس ایم کے کیہر اور ان کے پیش رو جسٹس ٹی ایس ٹھاکر اس کو مسترد کر سکتے تھے۔ چند برس قبل دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں ایک مذاکرے کے دوران موجودہ وزیر خزانہ ارون جیٹلی نے کہا تھا کہ: ''کشمیر کا واحد مسئلہ اس کا مسلم اکثریتی کردار ہے اور بھارتی آئین میں اس کی خصوصی پوزیشن نے اس کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے''۔ ان کے مطابق: ''کشمیر کی ترقی میں بھی یہ شق سب سے بڑی رکاوٹ ہے، کیوں کہ بھارت کے دیگر علاقوں کے لوگ وہاں بس نہیں سکتے جس کی وجہ سے سرمایہ کاری نہیں ہوسکتی''۔

یاد رہے کہ عشروں تک کشمیر میں خدمات انجام دینے والے انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس (IAS) اور انڈین پولیس سروس (IPS) سے وابستہ غیر ریاستی افراد بھی ریٹائرمنٹ کے بعد، کشمیر سے باہر زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ بیوروکریٹک سروس اور فوج ہی دو ایسے ادارے ہیں، جن کے بارے تصور کیا جاتا ہے کہ یہ بھارت کو متحدہ رکھنے میں ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنوبی صوبہ کیرالا کے کسی نوجوان کو سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب پنجاب کا کیڈر دیا جاتا ہے، تو باقی زندگی وہ عملاً پنجابی ہی کہلائے گا۔ اکثر اعلیٰ بیوروکریسی میں تعینات یہ نوجوان اپنے پیدایشی صوبے کو پس پشت ڈال کر، شادیاں اور رشتہ داریاں کیڈر والے صوبے میں ہی کرتے ہیں اور پھر ۳۰ سال سے زائد عرصہ سروس میں رہنے کے بعد اسی صوبے میں ریٹائرڈ زندگی گزارتے ہیں۔

اگرچہ جیٹلی، بی جے پی اور آر ایس ایس کے 'لبرل چہرے' کی سی شہرت رکھتے ہیں، مگر انھوں نے سوال اُٹھایا کہ: ''آخر مسلمان جہاں بھی تھوڑی اکثریت میں ہوتے ہیں، وہ اپنی

شناخت کیوں الگ رکھنا چاہتے ہیں؟ حالاں کہ ان کی اوّلین شناخت بھارتیہ ہونا اور اس کے کلچر کو ترجیح دینا ہونا چاہیے‘‘۔ ایک رپورٹر کی حیثیت سے مَیں اس مذاکرے میں سامع تھا، مگر میں نے جیٹلی صاحب کو یاد دلایا: ’’جناب، بھارتی آئین کی جن شقوں سے پریشانی کا اظہار کیا جارہا ہے، وہ ایک ہندو ڈوگرہ مہاراجا ہری سنگھ کی دین ہیں، جن کو بحال رکھنے کی گارنٹی دے کر ۱۹۴۷ء میں شیخ محمد عبداللہ کو شیشے میں اُتارا گیا۔ وادیِ کشمیر میں پنڈت لیڈر شنکر لال کول اور جموں میں ڈوگرہ سبھا کی ایما پر ۱۹۲۷ء میں مہاراجا نے یہ قانون نافذ کیا تھا، جس کی رُو سے اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی غیر ریاستی شخص، ریاستی حکومت میں نہ ملازمت کا حق دار ہوگا اور نہ غیر منقولہ جایداد رکھنے کا مجاز ہوگا‘‘۔

تاریخ کے اَوراق پلٹتے ہی مَیں نے انھیں یہ بھی یاد دلانے کی کوشش کی کہ: ’’جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ یا دیگر آزادی پسند تنظیموں کے منظرعام پر آنے سے بہت پہلے مئی ۱۹۴۷ء میں آر ایس ایس کی ایما پر ہندو مہاسبھا کی ورکنگ کمیٹی نے، جموں میں بلائے گئے ورکنگ کمیٹی کے ایک اجلاس میں پاس کی گئی قرارداد کے مطابق ایک ’ہندو اسٹیٹ‘ کو سیکولر بھارت کے ساتھ اپنی شناخت ضم نہیں کرنی چاہیے۔ وہ مہاراجا کو ہندو مفادات کا نگران تصور کرتے تھے۔ اُس وقت یہ پینترے بازیاں شاید اس وجہ سے ہو رہی تھیں کہ ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی صورت میں ہندو آبادی کے حقوق محفوظ کیے جائیں۔ تاریخ کے موڑ نے جب کشمیر کو بھارت کی جھولی میں گرادیا تو شناخت اور حقوق کے تحفظ کا مسئلہ مسلمانوں کی طرف پلٹ گیا‘‘۔

جموں و کشمیر کی مسلم اکثریتی شناخت نہ صرف فرقہ پرستوں بلکہ خود کو سیکولر کہلوانے والی سیاسی جماعتوں کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی ہے۔ فروری ۲۰۱۵ء کو جموں میں اپنی رہایش گاہ پر پی ڈی پی کے سرپرست اور سابق وزیراعلیٰ مرحوم مفتی محمد سعید سے ایک انٹرویو کے دوران میں نے بنیادی سوال پوچھا کہ: ’’کہیں بی جے پی کو اقتدار میں شریک کرواکے آپ کشمیریوں کے مصائب کی رات کو مزید تاریک کروانے کے مرتکب تو نہیں ہوں گے؟‘‘ جواب میں انھوں نے کہا کہ: ’’کشمیر کی خصوصی پوزیشن اور شناخت کے حوالے سے بھارت کی دونوں قومی جماعتوں کا موقف تقریباً ایک جیسا ہے‘‘۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک واقعہ سنایا: ’’مارچ ۱۹۸۶ء میں جب مَیں ریاستی کانگریس کا سربراہ تھا اور مَیں نے اس وقت کے وزیراعلیٰ غلام محمد شاہ کی حکومت سے حمایت واپس لی تھی، تو

وزیراعظم آنجہانی راجیو گاندھی کی خواہش تھی کہ اگلے دو سال تک سری نگر میں کانگریس کو حکومت کا موقع ملنا چاہیے۔ حکومت سازی پر بات چیت کے لیے مجھے دہلی بلایا گیا۔ وزیراعظم ہاؤس میں کیے گئے اجلاس میں کانگریس کے قومی کارگزار صدر ارجن سنگھ بھی شامل تھے۔ راجیو گاندھی نے ارجن سنگھ کو مخاطب کر کے پوچھا کہ کانگریسی حکومت کے برسرِاقتدار آنے کے بعد کیا ترجیحات ہونی چاہییں؟ ارجن سنگھ نے جواب دیا کہ پورا بھارت، جموں و کشمیر کے انڈین یونین میں مکمل انضمام کا خواہش مند ہے اور یہ عمل ۱۹۷۵ء کے بعد شیخ عبداللہ کے برسرِاقتدار آنے کے بعد رُک گیا تھا۔ اس عمل کو دوبارہ شروع کروانے اور منطقی انجام تک پہنچانے کی ضرورت ہے اور یہ ہماری حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا''۔

اسی دوران راجیو گاندھی نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا کہ ''گورنر ہاؤس اور مفتی سعید سے رابطہ رکھ کر ان کی بطور کانگریسی وزیراعلیٰ، حلف برداری کی تقریب کا اس طرح تعین کریں کہ مَیں بھی جموں جا کر تقریب میں شامل ہوسکوں''۔ مفتی سعید صاحب نے مزید کہا: ''میں اس بات چیت سے انتہائی دل برداشتہ ہوگیا، اور واپس جموں پہنچ کر ایسی صورتِ حال پیدا کر دی کہ کانگریس کی حکومت سازی کا پلان چوپٹ ہوگیا۔ پھر ایک سال بعد 'راجیو- فاروق ایکارڈ' کے نتیجے میں فاروق عبداللہ کی قیادت میں نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی مشترکہ حکومت قائم ہوئی''۔

مفتی سعید نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ: ''۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۵ء تک کشمیر کی انفرادیت اور شناخت کو بُری طرح مسخ کیا گیا ہے اور ایک طرح سے کشمیریوں کی عزت و آبرو کو تار تار کر کے برہنہ کیا گیا ہے۔ بھارت کے آئین کی دفعہ ۳۷۰ کی موجودہ شکل تو اب صرف زیر جامہ بچا ہوا ہے۔ مین اسٹریم، یعنی بھارت نواز کشمیری پارٹیاں چاہے نیشنل کانفرنس ہو یا پی ڈی پی، ان کا فرض ہے کہ اس زیر جامہ کو بچا کر رکھیں، جب تک کہ مسئلہ کشمیر کے دائمی حل کی کوئی سبیل پیدا ہو''۔

تاہم، یہ بات اب سری نگر میں زبان زد عام و خاص ہے کہ یہ وہ پی ڈی پی نہیں، جس نے ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۵ء کے درمیان دہلی کی روایتی کٹھ پُتلی حکومت کے بجائے ایک پُراعتماد اور کشمیری عوام کے مفادات اور ترجیحات کے ترجمان کے طور پر ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ اس سے قبل اقتدار کی شدید ہوس نے کشمیر کی سب سے بڑی قوم پرست پارٹی نیشنل کانفرنس کو بزدل بنا کر رکھ دیا تھا۔

یہی حال اب کچھ پی ڈی پی کا بھی ہے۔ بدقسمتی سے اس جماعت کا یہ محور بنا ہوا ہے کہ اقتدار کی نیلم پری پر دسترس کو کس طرح برقرار رکھا جائے؟

دفعہ ۳۵-اے دراصل بھارتی آئین کی دفعہ ۳۷۰ کی ہی ایک توسیع اور توضیح ہے۔ معروف قانون دان اے جی نُورانی کے بقول: ''آرٹیکل ۳۷۰ ، اگرچہ ایک عبوری انتظام تھا اور بھارتی حکومت کی ۶۰ کے عشرے تک یہ پالیسی تھی کہ جموں وکشمیر کے مستقبل کا فیصلہ استصواب راے سے کیا جائے گا۔ ۱۹۴۸ء میں جموں وکشمیر پر بھارتی حکومت کے ایک وائٹ پیپر میں سردار پٹیل کا یہ بیان موجود ہے: ''الحاق کو تسلیم کرتے ہوئے بھارتی حکومت نے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ اسے بالکل عارضی مانتی ہے، جب تک کہ اس بارے میں ریاست کے لوگوں سے ان کی راے نہیں معلوم کی جائے گی''۔ نُورانی کے بقول: ''جن سنگھ کے بانی شیاما پرساد مکھرجی، جن کا نام آرٹیکل ۳۷۰ کی مخالفت کرتے وقت بی جے پی اُچھالتی ہے، انھوں نے اس کی مکمل حمایت کی تھی۔ بی جے پی اس وقت کے وزیر داخلہ سردار پٹیل کا نام بھی اس پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرتی ہے کہ انھوں نے اس مسئلے پر پنڈت جواہر لعل نہرو کی مخالفت کی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پٹیل نے بھی آئین کی اس دفعہ کی مکمل تائید کی تھی''۔

اے جی نُورانی کا کہنا ہے کہ: ''کشمیر واحد ریاست تھی جس نے الحاق کے لیے اپنی شرائط پر حکومت سے مذاکرات کیے تھے۔ وہ بھارت میں ضم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے الحاق کیا تھا، اس لیے آرٹیکل ۳۷۰ دونوں کے درمیان ایک مقدس معاہدہ ہے، جس کی کسی شق میں کوئی بھی فریق یک طرفہ ترمیم نہیں کر سکتا''۔ نورانی اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ: ''این گوپال سوامی نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو اس سلسلے میں پہلی خلاف ورزی اس وقت کی، جب انھوں نے یک طرفہ طور پر مسودے میں تبدیلی کے لیے پارلیمنٹ کی لابی میں حتمی شکل دی تھی۔ جیسے ہی شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کو اس تبدیلی کا علم ہوا وہ دونوں ایوان کی طرف دوڑے، لیکن تب تک یہ ترمیمی بل پاس ہو چکا تھا۔ اس طرح یہ ایک افسوس ناک اعتماد شکنی کا معاملہ تھا۔ اگر اصل مسودہ پاس کیا جاتا تو ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کو اقتدار سے بے دخل کیا جانا ممکن نہ تھا۔ ۱۹۵۱ء میں کشمیر اسمبلی کے لیے جو انتخابات منعقد کیے گئے، ان سے بھارت کے جمہوری دعوؤں کی کشمیر میں قلعی تو اسی وقت کھل گئی تھی۔

انتخابی دھاندلیوں کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے گئے۔ تمام اُمیدوار 'بلامقابلہ' منتخب قرار پائے۔ یہ وہی اسمبلی تھی، جس نے ریاست کا دستور وضع کیا اور الحاق کے دستاویز کی توثیق کی تھی''۔

خود اس اسمبلی کے جواز پر سوال کھڑا کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ۵ فی صد سے بھی کم لوگوں نے اس کی تشکیل میں اپنے حق رائے دہی کا استعمال کیا تھا۔ یہ اسمبلی ریاست کا مستقبل اور اس کی حیثیت طے کرنے کے سلسلے میں دستور ساز اسمبلی کا درجہ رکھتی تھی۔ کشمیر کی اس آئین ساز اسمبلی کی حقیقت اور حیثیت کی قلعی خود اس وقت کے انٹیلی جنس سربراہ بی این ملک نے یہ کہہ کر کھول دی: ''ان اُمیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی کو مسترد کر دیا گیا، جو حزبِ مخالف کا کردار ادا کرنے کی اہلیت رکھتے تھے''۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ الحاق کی دستاویز کی توثیق اور کشمیر کے آئین کی منظوری کو کوئی عوامی تائید حاصل نہیں تھی۔ بہرحال پچھلے ۶۹ برسوں میں بھارتی حکومتوں نے آرٹیکل ۳۷۰ کو اس بُری طرح سے مسخ کر دیا ہے کہ اس کا اصلی چہرہ اب نظر ہی نہیں آتا۔ کئی مواقع پر خود کشمیری لیڈروں نے اپنی عزتِ نفس کا خیال نہ کرتے ہوئے ان آئینی خلاف ورزیوں کے لیے راہ ہموار کی۔ اگر ایک طرح سے یہ کہا جائے کہ آئین کی اس شق نے کشمیریوں کو سیاسی گرداب سے بچنے کے لیے جو کپڑے فراہم کیے تھے، وہ سب اُتر چکے ہیں اور اب صرف دفعہ ۳۵-اے کی صورت میں ایک نیکر بچی رہ گئی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ فرقہ پرست عناصر اب اسی نیکر کو اُتارنے، کشمیریوں کی عزت نیلام کرنے اور ان کو اپنے ہی وطن میں اقلیت میں تبدیل کروانے کے لیے ایک گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں، جس کے لیے عدالتی نظام کا سہارا لیا جارہا ہے۔

عدالت میں یہ معاملہ لے جاکر آر ایس ایس نے جموں وکشمیر کی آبادیاتی ساخت کی تبدیلی کے حوالے سے اپنے مکروہ عزائم واضح کر دیے ہیں۔ کانگریس کے سابق ریاستی صدر اور سابق مرکزی وزیر سیف الدین سوز کا کہنا ہے: ''سپریم کورٹ کی طرف سے اس پٹیشن کو شنوائی کے لیے منظور کرنا ہی باعثِ حیرت ہے''۔ اٹانومی اور سیلف رول کے ایجنڈوں کے خواب دیکھنا دُور کی بات ہے، فی الحال جس تیز رفتاری سے مودی سرکار اور اس کی ہم نوا ریاستی حکومت، کشمیریوں کے تشخص اور انفرادیت کو پامال کرنے کے حوالے سے جنگ آزمائی کے راستے پر چل نکلی ہے، اس کا توڑ کرنے میں نیشنل کانفرنس، پی ڈی پی کے باضمیر افراد اور حُریت پسند جماعتوں کو باہمی تعاون کرنے کی کوئی سبیل نکالنی چاہیے۔